© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ہیگل کا فلسفۂ تاریخ، جس نے موجودہ زمانے کے خیالات پر گہرا اثر ڈالا ہے، اور جس کے مقدمات پر کارل مارکس نے اپنی مادّی تعبیر تاریخ کی بنیاد رکھی ہے، مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقاء دراصل اضداد کے ظہور، تصادم اور امتزاج کا نتیجہ ہوتا ہے۔

تاریخ کا ہر دور ایک وحدت، ایک کُل، یا اگر استعارہ کی زبان میں کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ گویا ایک زندہ نظام جسمانی ہوتا ہے۔ اس دور میں انسان کے سیاسی، معاشی، تمدنی و اخلاقی، علمی و عقلی اور مذہبی تصورات ایک خاص مرتبے پر ہوتے ہیں۔ ان سب کے اندر ایک مناسبت، ایک ہم آہنگ کلیّت ہوتی ہے۔ وہ گویا اِس زندہ وجود، یا اِس عصری وحدت کے مختلف پہلو یا رُخ ہوتے ہیں، اور ان سب میں اس پورے دور کی روح طاری و ساری ہوتی ہے۔

جب ایک بڑا دور اپنی روح کو انتہائی مدارج تک ترقی دے چکتا ہے اور اُس دور کو چلانے والے اصول، نظریات اور افکار انسانی تہذیب و تمدن کو اپنی قوت و استعداد کی آخری حد تک پہنچا دیتے ہیں، تب خود اسی دور کی آغوش سے پرورش پاکر اسکا ایک عدو ظاہر ہوتا ہے، یعنی کچھ نئے افکار، نئے رجحانات، نئے نظریات اور نئے اصول خود اسی رو بزوال دور کے طبعی تقاضے سے پیدا ہو جاتے ہیں اور پرانے افکار سے لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ مدت تک قدیم اور جدید میں کشمکش جاری رہتی ہے۔ بالآخر کسر و انکسار کے بعد قدیم و جدید میں امتزاج ہو جاتا ہے۔ کچھ قدیم عناصر اور کچھ جدید عناصر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی آمیزش سے ایک نئی عصری تہذیب وجود میں آتی ہے اور اس طرح تاریخ کا ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ پھر اس نئے دور کی روح بھی جب اپنے انتہائی مدارج تک ترقی کرجاتی ہے، تو اس کی آغوش سے پھر ایک عدو ظاہر ہوتا ہے، پھر ایک کشمکش شروع ہوتی ہے، اور پھر کسر و انکسار کے بعد ایک نیا مرکب پیدا ہوتا ہے جو ایک نئے دور تہذیب و تمدن کی روح بن جاتا ہے۔

اس عمل ارتقاء کو ہیگل اپنی اصطلاح میں جدلی عمل (Dialectic process) کہتا ہے اس کے نزدیک عرصۂ تاریخ یا میدانِ دھر میں گویا ایک مسلسل منطقی مناظرہ و مجادلہ ہو رہا ہے۔ پہلے ایک دعویٰ (Thesis) سامنے آتا ہے۔ پھر اس کے مقابلہ میں جواب دعویٰ Antithesis پیش ہوتا ہے۔ پھر ایک طویل جھگڑے کے بعد عقلِ کل یا روح کل انکے درمیان صلح کراتی ہے، یعنی کچھ باتیں اس کی اور کچھ اُس کی قبول کر کے ایک مرکب (Synthesis) بنا دیتی ہے آگے چل کر یہ مرکب خود ایک دعویٰ بن جاتا ہے، پھر اس کا جواب دعویٰ مقابلہ میں آتا ہے، اور پھر انکے درمیان لڑائی کے بعد مصالحت ہوتی ہے اور ایک نیا مرکب بنتا ہے۔

ہیگل کے اس نظریہ کی رو سے جدلی عمل ایک کلّی اجتماعی عمل ہے۔ یعنی تاریخ کے ایک دور کی پوری انسانی تہذیب گویا ایک زندہ جسم یا ایک واحد وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور افراد اور گروہ گویا اس جسم کے اعضاء یا اجزاء ہیں۔ اپنے دور کے اجتماعی مزاج، یا اپنے دور کے تمدن و تہذیب کی ہمہ گیر روح سے کوئی فرد اور کوئی گروہ آزاد نہیں ہو سکتا۔ بڑے سے بڑے آدمی، نامور ترین تاریخی اشخاص تک اس جدلی کھیل، اس کُل کی کشمکش با خود میں شطرنج کے پیادوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس دریا کے طوفانی بہاؤ میں "خیالِ مطلق" شاہانہ شان کے ساتھ بے روک ٹوک تاریخ کی شاہ راہ پر خود ہی دعویٰ اور خود ہی جوابِ دعویٰ اور بالآخر خود ہی امتزاج بین الاضداد کرتا ہوا بڑھتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چلا جا رہا ہے۔ عقلِ کل یا جانِ جہاں کی ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ اشخاص اور گروہوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرتی ہے کہ اس تاریخی ڈرامہ میں وہ رہنمایانہ اور کارفرمایانہ پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ حالانکہ دراصل جانِ جہاں انہیں خود اپنی تکمیلِ ذات کے لیے استعمال کر رہی ہے[۱]۔

کارل مارکس نے ہیگل کے اس فلسفیانہ نظریہ میں سے جدلی عمل کا خیال تو لے لیا، مگر روح یا فکر کا تصور، جو ہیگلی فلسفہ کی جان تھا، اس سے الگ کر دیا۔ فکر کے بجائے اس نے مادّی اسباب یا معاشی محرکات کو تاریخی ارتقاء کی بنیاد قرار دیا۔ اس نے کہا کہ انسان کی زندگی میں سب سے اہم چیز معیشت ہے ایک تاریخی عہد کا معاشی نظام، اپنے عہد کی پوری انسانی تہذیب کی شکل و صورت بناتا ہے۔ ہر عہد میں قانون، اخلاق، مذہب، فلسفہ، علوم و فنون، اور فی الجملہ تمام انسانی افکار و تصورات (Ideologies) اُس نظامِ معیشت کے اثر سے یا اُس نظامِ معیشت کو چلانے اور قائم رکھنے کے لیے بنتے ہیں جو اس عہد کی سوسائٹی میں کارفرما ہو۔ اور تاریخ کے دوران میں جدلی عمل اس طرح ہوتا ہے کہ جب ایک معاشی نظام کے تحت ایک طبقہ اسباب زندگی کی فراہمی اور ان کی تقسیم پر قابض ہو کر دوسرے طبقوں کو کو اپنا دستِ نگر بنا لیتا ہے تو ان طبقوں میں بے چینی شروع ہوتی ہے اور وہ معاشی پیدا آوری (Production) اور اسباب زندگی کی تقسیم اور ملکیتی تعلقات Property relations

---

۱؎ ہیگل دراصل خدا کو عقلِ کُل (World reason) جانِ جہاں (World spirit) روحِ مطلق (Absolute spirit) اور فکرِ مطلق یا خیالِ مطلق (Absolute Idea) وغیرہ ناموں سے یاد کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی تمدن و تہذیب کے ارتقاء میں دراصل روحِ کُل یعنی ذاتِ خداوندی خود ترقی کر رہی ہے۔ خدا اس ارتقاء میں آپ اپنی نمائش کر رہا ہے۔ اپنی ذات کی تکمیل کے لیے کوشاں ہے۔ تاریخ کی شاہراہ پر مارچ کر رہا ہے اور انسان محض خارجی مظہر یا آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ایک نئے سسٹم کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ گویا اُس پرانے سسٹم کا جوابِ دعویٰ (Antithesis) ہے یا اُس کا عدو ہے جو خود اسکی آغوش سے پرورش پا کر نکلتا ہے۔ وقت کا قانون، مذہب، اور تصورات کا پورا مجموعہ اُس معاشی نظام کی حمایت کرتا ہے جو اس دور میں پہلے سے قائم تھا۔ نئی ابھرنے والی طاقتیں جن کا اصل مطالبہ معاشی نظام ہی کو بدلنے کے لیے ہوتا ہے، اس امر پر مجبور ہوتی ہیں کہ قانونی مذہبی اور اجتماعی تصورات کا ایک دوسرا مجموعہ مرتب کریں جو اُن کے مطلوبہ معاشی نظام سے مناسبت رکھتا ہو۔ ایک مدت تک طبقاتی نزاع (Class-struggle) برپا رہتی ہے۔ آخرکار اس نزاع سے معاشی نظام میں تغیر رونما ہوتا ہے اور اسکے ساتھ ہی پرانے قانونی، مذہبی، اخلاقی اور فلسفیانہ تصورات کو نئے تصورات کے لیے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔

یہ مارکس کی مادّی تعبیرِ تاریخ ہے جسکو تاریخی مادّیت (Historical materialism) یا جدلی مادّیت (Dialectic materialism) کہا جاتا ہے۔ اس میں انسانی تمدن و تہذیب کے ارتقاء اور تاریخ کے تمام تغیرات کا محور اسبابِ معیشت کی فراہمی اور تقسیم کے سوال کو قرار دیا گیا ہے۔ مارکس کی نگاہ میں پوری انسانی زندگی اسی محور پر گھومتی ہے اور اس کو حرکت دینے والی طاقت طبقاتی نزاع کی طاقت ہے۔

یہاں ہیگل اور مارکس کے نظریات پر کوئی تفصیلی تنقید کرنے کا موقع نہیں ہے۔ یہ ایک اہم موضوع ہے جس پر انشاء اللہ عنقریب ایک مبسوط بحث ان صفحات میں کی جائیگی۔ یہاں جو کچھ بتانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ان نظریات نے مذہب، اخلاق اور تہذیب و عمران کے متعلق موجودہ زمانہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر غلط کر کے رکھ دیا ہے۔

جو لوگ ہیگل سے متاثر ہوئے ہیں، ان کے دماغ میں دو باتیں گہری جڑوں کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیٹھ گئی ہیں :-

ایک یہ کہ ہر دور کی پوری کلچر ایک وحدت ہوتی ہے۔ اخلاق، قوانین، مذہب، سائنس، فلسفہ، آرٹ اور بین الانسانی روابط جو ایک دور میں پائے جاتے ہیں، سب کے سب اپنے دور کے اجتماعی مزاج یا اپنے عہد کی کلّی روح کے مظاہر ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ جب ایک کلچر خوب پک چکتی ہے تو خود بخود تاریخی اسباب سے اسی کلچر کے اندر سے رجحانات کا ایک نیا مجموعہ، افکار، نظریات اور تصورات کا ایک نیا لشکر نمودار ہوتا ہے، جو پرانے اصول تہذیب و تمدن سے جنگ کرتا ہے، یہاں تک کہ ایک نئی تہذیب وجود میں آتی ہے جس میں پرانی کلچر کے صالح عناصر باقی رہ جاتے ہیں، اور غیر صالح عناصر کی جگہ نئے رجحانات کے قیمتی اجزاء لے لیتے ہیں۔ اس طرح یکے بعد دیگرے جو نئی تہذیبیں وجود میں آتی چلی جاتی ہیں ان میں سے ہر بعد کی تہذیب پرانی تہذیبوں سے افضل ہوتی ہے، کیونکہ وہ پرانی تمام تہذیبوں کے صالح اجزاء پر مشتمل ہونے کے ساتھ نئے افکار و نظریات کے قیمتی اجزاء بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے ذہن میں یہ دو خیال جم گئے ہوں وہ درحقیقت کسی ایسی تعلیم پر ایمان رکھ ہی نہیں سکتے جو اب سے صدیوں پہلے (ان کے عقیدہ کے مطابق ایک گذرے ہوئے تہذیبی دور میں) دی گئی ہو۔ ان کے سامنے جب ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد علیہم السلام کے نام لیے جائیں گے تو وہ یہی جواب دیں گے کہ "یہ سب کے سب اپنے اپنے دور کی پیداوار تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے عہد کی کلچر کے مقابلہ میں ایک جواب دعویٰ (Antithesis) پیش کیا تھا، جو ایک کشمکش کے بعد ایک مرکب تہذیب (Synthesis) کا جزء بن گیا۔ اسکے بعد اور کتنے ہی جواب دعوے پیش ہو چکے ہیں اور کتنے ہی مرکب بن چکے ہیں، یہاں تک کہ انسانی تہذیب ترقی کرتے کرتے ہمارے اس دور تک پہنچی ہے۔ ہم ان لوگوں کی قدر اس لحاظ سے ضرور کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عہد میں انسانی تہذیب کو آگے بڑھانے کے لیے کام کیا۔ مگر اب کسی پرانے جواب دعوے کو پھر سے سامنے لانے کا کونسا موقع ہے؟"

مارکس کے پیرو ہیگل کے متبعین کے ساتھ مذکورہ بالا دونوں خیالات میں شریک ہیں، اور پھر ایک تیسرے خیال کا ان کے دماغ پر مزید تسلط ہو گیا ہے۔ وہ ان تمام مذہبی، اخلاقی اور قانونی تصورات کو، جو کسی خاص تاریخی عہد میں رونما ہوئے ہوں، اُسی خاص دور کے معاشی نظام کی پیدا کردہ چیز سمجھتے ہیں، اور مزید براں اُن کا خیال یہ بھی ہے کہ یہ تصورات اور اصول و قوانین اپنے ہی دور کے معاشی نظام کی حمایت و حفاظت کیا کرتے ہیں۔ لہذا منطقی طور پر ان کے اس عقیدہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب انسان کی معاشی ضروریات مہیا کرنے اور تقسیم کرنے کا طریقہ (System of production and distribution) بدل جائے تو اسکے ساتھ ہی مذہب، اخلاق، قانون ہر چیز کو بدل جانا چاہیے، کیونکہ ان کا جوڑ صرف پرانے نظام معیشت ہی کے ساتھ تھا، نئے نظام کی روح سے ان کو کوئی مناسبت نہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ اس مارکسی نظریہ پر جو شخص اعتقاد رکھتا ہو وہ صدیوں پہلے کی کسی مذہبی تعلیم یا کسی شریعت یا کسی اخلاقی سسٹم پر ایمان رکھ سکتا ہے؟

ابھی حال میں ہمارے ایک اشتراکی بھائی نے "سوشلزم کیا نہیں ہے" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے ثابت کرنا چاہا تھا کہ سوشلزم اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ممکن ہے انکی طرح بعض دوسرے اشتراکی حضرات بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں، اس لیے میں ان سے عرض کرونگا کہ ایک مرتبہ وہ مارکس کی مادّی تعبیر تاریخ اور اسکے منطقی نتائج پر اچھی طرح غور کریں، اور پھر سوچیں کہ اس نظریہ کو تسلیم کرنے کے بعد کسی شخص کے لیے اپنے آپ کو مسلمان کہنے کی کونسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گنجائش باقی رہتی ہے - ہر شخص کو عقیدہ کے انتخاب کا حق حاصل ہے - وہ اگر مارکسی نظریہ کو صحیح سمجھتے ہیں تو اُسے ضرور اختیار کریں - مگر انہیں کم از کم اپنے دماغ کو تو صاف رکھنا چاہیے - ایک عقیدہ کی پیروی کے ساتھ یہ دعوٰی کرنا کہ ہم ساتھ ہی اسکی ضد کے بھی معتقد ہیں، سخت دماغی الجھاؤ کا پتہ دیتا ہے اور یہ البتہ افسوسناک ہے -

---

ہیگل اور مارکس دونوں نے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، مگر دونوں اسکی یافت میں ناکام ہوئے ہیں - انہوں نے حقیقت کے صرف ایک جزء کو پایا اور اسے کُل حقیقت قرار دینے کی کوشش کی - نتیجہ یہ ہوا کہ خود بھی غلطی میں مبتلا ہوئے اور دوسروں کے لیے بھی غلط فہمیوں کا ایک جال بنا کر چھوڑ گئے -

ہیگل کے فلسفۂ تاریخ میں جو چیز صحیح ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ تاریخ کے دوران میں انسانی تمدن و تہذیب کا ارتقاء، اضداد کی جنگ اور پھر انکی مصالحت کی صورت میں ہوتا رہا ہے لیکن اس صحیح خیال کے ساتھ اس نے بہت سے غلط تخیلات کی آمیزش کر کے ایک ایسے نظریہ کی عمارت کھڑی کر دی جس کے اکثر ستون محض ہوا پر کھڑے کیے گئے ہیں - اس کا خدا کو روحِ عالم قرار دینا اور یہ کہنا کہ خدا انسان کو خود اپنی تکمیل کا آلہ بنا رہا ہے، اور انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کی تاریخ دراصل اپنے منتہائے کمال کی طرف خود خدا کے سفر کی تاریخ ہے، یہ سب کچھ محض ایک مہمل خیال آرائی ہے جس کے لیے زمین و آسمان میں کوئی ثبوت ــــ جسے ثبوت کہا جا سکے ــــ موجود نہیں - پھر اس کا یہ خیال کہ تاریخ کے تھیٹر میں انسان محض ایک بے شعور یا بے اختیار، بے ارادہ ایکٹر ہے، اور یہ کہ دراصل وہ خدا ہی ہے جو انسانوں کے واسطے سے متضاد افکار پیش کرتا ہے، ان کو لڑاتا ہے اور پھر ان کے درمیان مصالحت سے فکر و خیال کی نئی صورتیں بناتا رہتا ہے، یہ بھی ایک بے ثبوت اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے بنیاد قیاس ہے جس کی تائید کسی علمی حقیقت سے نہیں ہوتی۔ یہ ہیگل کی بنیادی غلطیاں ہیں جنہوں نے اسکے پورے فلسفے کو ایک چیستاں بنا دیا ہے۔ اسکے بعد جب ہم اسکے جدال تاریخی کے نظریہ کو دیکھتے ہیں، تو باوجودیکہ یہ نظریہ اپنے اندر صداقت کی ایک جھلک رکھتا ہے، ہمیں اس کے اندر قیاس آرائی (Speculation) کا عنصر بہت زیادہ اور تاریخ کے حقیقی واقعات سے استشہاد بہت کم نظر آتا ہے۔ اس نے یہاں تک تو ٹھیک اندازہ لگایا کہ تاریخ کے دوران میں متضاد خیالات کے درمیان نزاع برپا رہی ہے، اور پھر ان اضداد کے درمیان مصالحت ہو کر ان کا ایک مرکب انسانی تہذیب و تمدن کا جزء بنتا رہا ہے۔ مگر اس نے واقعات کے اندر اتر کر یہ تحقیق کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی کہ جن اضداد کے درمیان نزاع ہوتی ہے انکی حقیقی نوعیت کیا ہے، پھر ان کے درمیان مصالحت کیوں ہوتی ہے، اور اس مصالحت سے جو مرکب بنتا ہے وہ آگے چل کر پھر کیوں اپنے اندر سے ایک عدو پیدا کرتا ہے۔ اس جدلی عمل کا تفصیلی اور تحلیلی مطالعہ کرنے کے بجائے، ہیگل اس پر یوں نگاہ ڈالتا ہے جیسے کوئی پرندہ فضا میں اڑتے ہوئے کسی شہر کا ایک مجمل جائزہ لیتا ہو۔

مارکس کو اتنی بلند خیالی بھی نصیب نہیں ہوئی جو ہیگل کے حصہ میں آئی ہے۔ وہ انسان کی فطرت، اسکی ساخت اور اسکی ترکیب کو جاننے اور سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ وہ باہر کے حیوان کو تو دیکھ لیتا ہے جسے معاشی ضروریات لاحق ہوتی ہیں، مگر اس اندر کے انسان کو نہیں دیکھتا جو اس بیرونی حیوان کے خول میں رہتا ہے جسکے لیے بیرونی حیوان کو آلہ بنایا گیا ہے اور جسکی فطرت کے مقتضیات بیرونی حیوان کی طبیعت کے مقتضیات سے بہت مختلف ہیں۔ اس کم نظری و کوتاہ بینی نے اس کے تمام عمرانی نظریات کو غلط کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اندر کا انسان باہر کے حیوان کا تابع اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غلام ہے۔ اسکو عقل، استدلال، فکر، جستجو، مشاہدہ، وجدان، تحقیق اور تخلیق کی جو قوتیں دی گئی ہیں وہ سب کی سب محض بیرونی حیوان کی خواہشات، اغراض اور ضروریات کی خدمت کے لیے ہیں۔ لہذا انسان نے آج تک اسکے سوا کچھ نہیں کیا، نہ وہ آئندہ کریگا، نہ وہ اسکے سوا کچھ کرسکتا ہے کہ بس اپنے آقا، یعنی باہر کے حیوان کی داعیات کے مطابق اخلاق اور قانون کے اصول بنائے، مذہب کے تصورات گھڑے، اور اپنے لیے زندگی کا راستہ معین کرے — انسان کی حقیقت کا یہ کتنا گھٹیا اندازہ ہے! تہذیب کا کتنا ذلیل تصور ہے، اور کتنا پست ہے، وہ ذہن جو اس تصور کو پیدا کرتا اور قبول کرتا ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ بیرونی حیوان کے احساسات اور داعیات، اندرونی انسان کی قوت فیصلہ پر اثر ڈالتے ہیں، اور اس سے بھی انکار نہیں کہ بہت سے انسان اپنی حیوانیت سے مغلوب ہوتے ہیں۔ مگر مارکس کا یہ خیال کتنا غلط ہے کہ اندر کا انسان باہر کے حیوان پر کوئی حاکمانہ اثر نہیں ڈالتا؟ اور اس نے تاریخ تہذیب انسانی کو کتنا غلط پڑھا ہے کہ ساری تہذیب اس کو انہی انسانوں کی بنائی ہوئی نظر آتی ہے جنکی انسانیت، حیوانیت کی تابع تھی؟ حالانکہ اگر وہ آزاد نگاہ سے دیکھتا تو اسے نظر آتا کہ انسانی تہذیب میں جو کچھ قیمتی اور شریف اور صالح ہے وہ سب ان لوگوں کا عطیہ ہے جنہوں نے حیوانیت کو انسانیت کا تابع اور محکوم بنا کر رکھا تھا، اور جنہوں نے اپنی طاقتور شخصیت سے حیوان صفت انسانوں کی عظیم اکثریت کو متاثر کرکے تہذیب، شائستگی، اخلاق و روحانیت، اور عدل و انصاف کے اصول انسانی زندگی میں داخل کیے تھے۔

اگر ہیگل اور مارکس نے قرآن کو پڑھا ہوتا تو انہیں انسان کی حقیقت کو سمجھنے اور ارتقاء تہذیب انسانی کے اساسی قانون کو دریافت کرنے میں وہ ٹھوکریں نہ لگتیں جو انہوں نے خود گمان اور قیاس کے تکے لڑانے کی وجہ سے کھائی ہیں۔ قرآن کا علم الانسان اور فلسفۂ تاریخ ان تمام مسائل کو نہایت صحیح اور تشفی بخش طریقہ سے حل کرتا ہے جن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں یہ لوگ الجھ کر رہ گئے ہیں۔

قرآن کی رو سے انسان محض اُس حیوانی (Biological) وجود کا نام نہیں ہے جو بھوک، شہوت، حرص، خوف، غضب وغیرہ داعیات کا محل ہے، بلکہ دراصل "انسان" وہ روحانی وجود ہے جو اس اوپر کے حیوانی خول کے اندر رہتا ہے، اور اخلاقی احکام کا محل ہے۔ اُس کو دوسرے حیوانات کی طرح محض جبلت (Instinct) کا غلام نہیں بنایا گیا ہے بلکہ اسے عقل، تمیز، اکتساب علم اور فیصلہ کی قوتیں دے کر ایک حد تک خود اختیاری (Autonomy) عطا کی گئی ہے۔ دوسرے حیوانات کی طرح قدرت اسے ایک سے لگے باندھے راستے پر نہیں چلاتی اور نہ اسکی ضروریات کی بالکلیہ خود کفیل بنتی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے کوشش (سعی) کی قوت دے کر دنیا میں چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ جو کچھ حاصل کرے اپنی کوشش سے کرے، اپنی کوشش کے لیے جو رُخ اور جو راستہ چاہے اختیار کرے اور اپنے اختیار کردہ رُخ پر جہاں تک بڑھ سکتا ہے بڑھتا چلا جائے۔ اسی خود اختیاری کی حامل اور اسی کوشش کی قوت رکھنے والی، اور اپنی کوشش کے لیے خود ہی سمت اور راستہ منتخب کرنے والی روح کا نام انسان ہے، اور باہر کا حیوان اسے خادم اور آلۂ کار کے طور پر دیا گیا ہے۔ یہ خادم جاہل ہے۔ اِسکے پاس صرف خواہشات اور جسمانی مطالبات ہیں۔ اِس کا نصب العین محض اپنے مرغوبات کو حاصل کرنا اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ یہ اندر کے انسان کو اُلٹا اپنا ہی خادم بنانا چاہتا ہے اور اُسے مجبور کرتا ہے کہ اپنی عقلی و علمی طاقتوں کو محض اِس کے حیوانی مقاصد کی تحصیل کا آلہ بنا کر رکھ دے۔ یہ اسکی پرواز فکر کو اوپر کے بجائے نیچے کی طرف مائل کرتا ہے اسکی نگاہ کو تنگ کرتا ہے۔ اسے محسوسات کا غلام بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اسکے اندر جاہلیت کے تعصبات پیدا کرتا ہے۔ برعکس اسکے وہ انسان جو اندر بیٹھا ہے، اسکی فطرت تقاضا کرتی ہے کہ اس بیرونی حیوان کو اپنا خادم بنائے۔ اللہ نے اسکو فجور اور تقویٰ کا الہامی علم دیا ہے۔ نیکی اور بدی کے دونوں راستوں (نجدین) میں تمییز کرنے کی استعداد بخشی ہے۔ اسکے اندر ایک ایسی اخلاقی حس رکھ دی ہے جو اندر ہی اندر تقاضا کرتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ وہ اپنی حیوانی ضروریات کو بھی انسانیت کے شایانِ شان طریقہ پر پورا کرے ۔ وہ حیوانی طریقے اختیار کرنے میں آپ سے آپ شرم محسوس کرتا ہے ۔ اسکا نصب العین حیوانیت کے نصب العین سے بلند تر ہے ۔ وہ ایک زیادہ اعلیٰ درجہ کے وجود میں تبدیل ہونا چاہتا ہے ۔ اسکے اندر وجدانی طور پر یہ طلب پائی جاتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اسکی زندگی کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کے لیے ہے ۔

پوری انسانی تاریخ دراصل اسی کشمکش کا ایک مرقع ہے جو اندر کے انسان اور باہر کے حیوان میں برپا ہے ۔ باہر کا حیوان اندرونی انسان کو نیچے کھینچتا ہے اور اپنا تابع بنا کر زندگی کے وہ ٹیڑھے راستے پیدا کرتا ہے جن میں ظلم اور عدوان ہے، فحشا اور منکر ہے، گناہ اور بغی ہے، شہوات کی بندگی ہے، لذات نفس کی غلامی ہے، انسانی تعلقات اور روابط کی ناہمواری ہے ۔ اندر کا انسان اس حالت سے مطمئن نہیں ہوتا اور اس کے خلاف بغاوت کرتا ہے مگر بیرونی حیوان کو اپنا تابع بنانے کی کوشش میں وہ کچھ دوسرے ٹیڑھے راستے پیدا کر لیتا ہے جن میں رہبانیت اور ترک دنیا ہے، نفس کشی اور فطری ضروریات سے انحراف ہے، تمدن اور اجتماعی زندگی کے فرائض سے فرار ہے ۔ بیرونی حیوان بھی اسکے خلاف بغاوت کرتا ہے اور انسان کو اپنے ٹیڑھے راستوں کی طرف کھینچ لے جاتا ہے ۔

افراط اور تفریط کی یہ دونوں طاقتیں بار بار اپنا زور کرتی ہیں ۔ ہر ایک کے اثر سے کچھ ایسی نظریات اصول اور طریقے پیدا ہوتے ہیں جو ایک عنصر حق کا اور کچھ عناصر باطل کے اپنے اندر رکھتے ہیں ۔ کچھ دنوں تک انسان ان اصولوں اور طریقوں کا تجربہ کرتا ہے، اور آخر کار اسکی اصلی فطرت اجو بیچ کی صراط مستقیم کے لیے بیچین رہتی ہے، ٹیڑھے راستوں سے بیزار ہو کر انکے باطل عناصر کو پھینک دیتی ہے، اور انکے صرف وہ حصے انسانی زندگی میں باقی رہ جاتے ہیں جو حق اور راست ہیں ۔ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۔ لیکن افراط و تفریط کے ایک مجموعہ کی ناکامی کے بعد ایک دوسرا مجموعہ میدان میں آجاتا ہے، پھر کچھ مدت تک کشمکش برپا رہتی ہے، اور پھر انسانی فطرت اسے رد کر دیتی ہے ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسطرح تاریخ کے دوران میں انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقاء ایک ایسی خطِ منحنی کی شکل میں ہوتا ہے جو بار بار ایک خطِ مستقیم کے گرد چکر کاٹتا چلا جاتا ہے۔ اسکی مثال اِس نقش کی سی ہے:۔ ۲

اس مثال میں ۲۔ب انسانی زندگی کا وہ فطری راستہ ہے جسے قرآن صراطِ مستقیم، رُشد، ہدایت سبیل اللہ وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ انسانیت ابتداء میں اپنی فطری حالت پر تھی (کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً)۔ پھر انسانوں میں اپنی حدِ جائز سے گذرنے کے میلانات پیدا ہوئے (وَمَا اخْتَلَفَ فِیْہِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْہُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْھُمُ الْبَیِّنٰتُ بَغْیًاۢ بَیْنَھُمْ)۔ یہ میلانات انسان کو بار بار صراطِ مستقیم سے ہٹا کر دور لے گئے ——— اور ہر بار تجربات کی تلخی اور انسانی فطرت کی بےچینی اسکو راہِ فطرت کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کرتی رہی، مگر انسان راہِ فطرت پر پہنچ کر پھر دوسری طرف دور نکل گیا، اور پھر فطرت کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوا۔ ہیگل جن کو دعویٰ اور جوابِ دعویٰ کہتا ہے وہ وہی انتہا پسندانہ میلانات ہیں جو کبھی خطِ مستقیم کے اسطرف اور کبھی اسطرف انسان کو کھینچ کرلے جاتے ہیں۔ اور وہ جسے ترکیب و امتزاج سے تعبیر کرتا ہے وہ بعینہٖ وہ نقطے ہیں جہاں یہ خطِ منحنی صراطِ مستقیم کو کاٹتا ہے۔ ہیگل اور مارکس دونوں کو تاریخ میں یہ خطِ منحنی تو نظر آگیا، مگر وہ اُس خطِ مستقیم کو نہ دیکھ سکے جو ازل سے ابد تک سیدھا کھنچا ہوا ہے، جس پر چلنے کے لیے انسان کی اصلی فطرت خود بخود اندر سے تقاضا کرتی ہے، جس کا ان ٹیڑھے راستوں کے درمیان موجود ہونا ایک ایسی حقیقت ہے کہ ہر انسان کا قلب اسکی شہادت دیتا ہے، اور جسکو تلاش کرنے کی بےچینی ہر سوچنے والے انسان کے اندر موجود ہے۔

انبیاء علیہم السلام وہی لوگ ہیں جنکو یہ صراطِ مستقیم معلوم تھی، جنہوں نے بار بار آکر انسان کو اس درمیانی راہِ راست کی طرف بلایا، اور جنہوں نے اس سیدھے خط پر انسانی تہذیب کو قائم کرکے بتادیا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید۔۳) ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلیلیں دیکر بھیجا اور انکے ساتھ کتاب اور میزان (ترازو) اتاری تاکہ لوگ عدل کے طریقہ پر قائم ہوں۔

© rasailojaraid.com